دستور الفصاحت

اس کی ترتیب اور حواشی پر ایک تنقیدی نظر

از

محترمہ آمنہ خاتون ایم۔ اے لکچرر فارسی و اردو مہارانی کالج میسور

اردو زبان کے قواعد پر قدمائے جو دو چار کتابیں لکھی ہیں اُن میں میر انشاء اللہ خاں انشاؔ کی دریائے لطافت کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اُس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جل سکا۔ حالانکہ اسی زمانہ میں سید احمد علی یکتا لکھنوی نے دستور الفصاحت کے نام سے اسی موضوع پر جو کتاب لکھی تھی وہ انشاء کی کتاب کی طرح دلچسپ نہ سہی۔ بہرحال فنی افادی حیثیت سے کسی طرح بھی اس سے کم نہیں کہی جاسکتی۔

اس کتاب کے شروع میں مصنف نے اردو زبان کی پیدائش ترقی اور اس کی وسعت سے بحث کی ہے۔ پھر چند ابواب اور ذیلی عنوانات کے ماتحت صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، عروض اور قافیہ کے قواعد و ضوابط بیان کئے ہیں۔ خاتمہ میں ۳۵ ایسے شاعروں کا ذکر ہے جن کے اشعار کتاب کے اندر بطور سند پیش کئے گئے ہیں لیکن اپنی اس افادیت اور اہمیت کے باوجود اس کتاب کی گمشدگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ اس کے نام تک سے واقف نہیں تھے۔ خوش قسمتی سے مئی ۱۹۳۹ء میں اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ عالیہ رامپور کے لئے خرید کیا گیا اور کتاب خانہ کے ناظم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کتاب کا مقدمہ اور خاتمہ اپنی تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کرکے اس خزانہ کو اربابِ ذوق کے لئے عام کردیا۔ علاوہ

تصحیح وتحشیہ کے موصوف نے ایک نہایت فاضلانہ اور مفید وپُراز معلومات مقدمہ بھی لکھا ہے جو عام ارباب ذوق اور تاریخ ادب اردو کے طلبا کے لئے خاص طور پر بڑے کام کی چیز ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی کتاب کی ترتیب اور اس کے حواشی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

چونکہ ہمارے اس مقالہ کا خطاب براہِ راست کتاب کے فاضل مرتب سے ہے اس بنا پر ضمیر غائب استعمال کرنے کی بجائے ہم نے جگہ جگہ "آپ" لکھا ہے۔

دیباچۂ مصحح

واوین میں جو عبارتیں ہیں وہ دستور الفصاحت کی ہیں اور بقیہ الفاظ میرے اپنے مخطوطے کے جملہ ورقوں کی تفصیل یوں لکھی ہے ص۱۲

شروع کے فاضل + درمیان کے اصل + آخر کے فاضل

۲ + ۲۱۹ + ۱ = ۲۲۲ جملہ ورق

ص۱۲ " ورق ۳ ب سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے" حالانکہ کتاب کا آغاز ۳ الف سے ہوا ہے۔

ص۱۲ " اسی قلم سے ورق ۲۲۱ ب میں قطعۂ تاریخ کے مادے کے اوپر اعداد ۱۲۴۹ لکھے گئے ہیں" اور متن مطبوعہ میں مندرج ہندسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہی ۲۲۱ ب صحیح ہے لیکن دیباچے کے ص۲ کی پہلی سطر میں خاتمے کے ختم کے ہندسے ۲۱۹ ب لکھے ہیں "خاتمہ (ورق ۱۸۷ الف - ۲۱۹ ب)" یہ کمپوزنگ کی معمولی غلطیاں ہیں۔

مخطوطے میں مختلف تحریریں ص۱۲ " ورق ا ب اور ۲ الف پر کتاب کا تھوڑا سا دیباچہ نقل کیا گیا ہے" اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کتاب کا جو اصل دیباچہ ۳ الف سے شروع ہوا ہے (س صیغۂ عبودیت) اسی کا تقریباً ڈیڑھ صفحہ فاضل اوراق پر نقل کیا گیا ہے۔ اگر یہ دیباچہ اصل دیباچے سے مختلف ہوتا تو آپ لکھتے کہ ایک "ادھورا" دیباچہ" لکھا ہے۔ بہر حال اس کی صراحت ضروری ہے اور مخطوطے میں اس

تھوڑے سے دیباچے کے بعد دو قطعے لکھے ہیں اور ان کے نیچے لکھا ہے "کاتب الحروف بندہ شیخ دلاور علی بہاری بمقام موتیہاری" جس طرح آپ نے اکبر پور کا محل وقوع لکھا ہے (ص۶۹) اسی طرح اگر موتیہاری کا محل وقوع بھی تحریر فرماتے تو قارئین کو واقعات کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی۔

ص۱۳ "آخر میں کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے" الکاتب الخاتمہ ہدایت علی الموہانی" مگر یہ صرف خاتمۂ کتاب کا کاتب معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائی ابواب کے کاتب کا نام مذکور نہیں ہے۔ غالباً وہ شیخ دلاور علی بہاری ہوگا"۔

میری رائے میں اگر دلاور علی ابتدائی ابواب کا کاتب ہوتا تو اس کا نام خاتمے سے پہلے ص۱۸۷ پر لکھا ہوتا کیونکہ جو شخص ڈیڑھ صفحہ اور دو قطعے لکھنے کے بعد اپنا نام لکھنا ضروری سمجھے وہ ۱۸۴ صفحے لکھنے کے بعد ضرور اپنا نام لکھتا یا اگر دلاور علی کی تحریر اصل کتاب کی تحریر سے ملتی ہو تو وہی اس کا کاتب قرار دیا جاسکتا ہے اور جب آپ نے لکھا ہے کہ موہانی صرف خاتمۂ کتاب کا کاتب معلوم ہوتا ہے تو خاتمے کی تحریر اصل کتاب کی تحریر سے ضرور مختلف ہوگی۔

ص۱۲ "پہلے صفحے پر سیاہ مربع مہر ہے۔ مہر کے اندر "اللہ حافظ مہر کتاب خانۂ محمد مردان علی خاں رعنا ۱۲۸۲ھ" منقوش ہے"۔

ص۱۳ "۳ الف کے بائیں گوشے میں" مولفہ سنہ ۱۲۴۹ھ از تالیف سید احمد علی یکتا لکھنوی" غالباً یہ رعنا کے قلم کی تحریر ہے اسی قلم سے ورق ۲۲۱ ب میں قطعۂ تاریخ کے مادے کے اوپر اعداد ۱۲۴۹ لکھے گئے ہیں"

ص۱۴ ورق ۱۴۵ ب اور ۱۷۳ الف کے حاشیوں پر جو ترمیم و اضافہ ہوا ہے وہ آپ کی رائے میں یکتا کے قلم سے ہے۔

ص۱۵ آخر میں ایک ورق منضم ہے جس پر چٹنی کا ایک نسخہ "جناب حکیم سید احمد علی خاں صاحب قبلہ" کا تجویز کیا ہوا درج ہے"۔

خلاصہ یہ کہ اب تک مخطوطے کی مختلف تحریروں کے جو کاتب آپ نے معین کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اب۔ ۲ الف تھوڑا سا دیباچہ مع دو قطعات . . . . . کاتب شیخ دلاور علی بہاری بمقام موتیہاری۔

(۲) ۳ الف۔ ۱۸۷ الف۔ ابتدائی ابواب . . . . . کاتب شیخ دلاور علی۔

(۳) ورق ۱۴۵ ب اور ورق ۱۷۲ الف پر ترمیم و اضافہ، بشرطیکہ حاشیے کا خط متن کے خط سے نہ ملتا ہو کاتب یکتا

(۴) ۱۸۷ الف۔ ۲۱۹ ب خاتمہ . . . . . کاتب ہدایت علی موہانی

(۵) ۳ الف اور ۲۱۹ ب . . . . . کاتب غالباً رعنا۔

(۶) ۲۲۲ الف چٹنی کا نسخہ . . . . . کاتب نامعلوم

ان تحریروں کے پیش نظر آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے:۔

ص۱۵ سطر ۲۔ ۱۰ "میرا خیال ہے کہ ہمارا نسخہ (ج) مصنف کے اس نسخے (ا) کی نقل ہے (ب) جو رمضان علی لکھنوی نے تیار کیا تھا" یعنی یکتا نے پہلے ایک مسودہ لکھا اس کو آ گئے۔ پھر اس کو رمضان علی نے نقل کیا۔ اس کو ب کہئے۔ اب جو نسخہ آپ کے پیش نظر ہے وہ ب کی نقل ہے۔ اس کو ج کہئے۔ اور ساری بحث اسی نسخۂ ج سے متعلق ہے۔

غالباً اس میں (ب) بعض مقامات مشتبہ رہ گئے تھے جن کے مقابل حاشیے پر مصنف نے اپنا شک ظاہر کیا تھا" یعنی نسخۂ ب کے حاشیوں پر مصنف نے اپنا شک ظاہر کیا تھا یعنی مصنف کو اس کے باوجود کہ نظر ثانی کرتے وقت اس کو حسب خاطر درست کرے بعض مقامات مشتبہ رہ گئے تھے۔

"ہمارے نسخے (ج) کے کاتب نے حاشیے کی عبارتوں کو بھی بعینہ نقل کر لیا۔ جب یہ نسخہ (ج) مصنف نے دیکھا تو حاشیوں کو قلمزد کر کے متن میں ان مقامات کی تصحیح کر دی"۔

یعنی جب نسخۂ ج کو جو آپ کے پیش نظر ہے یکتا نے دیکھا تو الخ

"نیز اس نظر میں وہ غلطیاں بھی درست کر دیں جو پہلے نسخے کے مطالعے کے وقت خیال میں نہ آئی تھیں

یعنی نسخۂ ج کو دیکھتے وقت مصنف نے وہ غلطیاں بھی درست کردیں جو نسخۂ ب کے مطالعہ کے وقت خیال میں نہ آئی تھیں۔" نتیجہ یہ کہ

(۱) آپ کے پیش نظر جو نسخۂ ج ہے وہ یقیناً شیخ رمضان علی کا لکھا ہوا نسخۂ ب نہیں ہے۔

(۲) نسخۂ ج میں یکتا نے جا بجا اپنے قلم سے اصلاح دی ہے۔

(۳) نسخۂ ج میں یکتا نے امکان بھر کوئی غلطی نہ رہنے دی۔

پہلے نتیجہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ آپ کے پیش نظر جو نسخہ ہے اس کے ابتدائی ابواب رمضان علی ہی کے لکھے ہوئے ہیں جیسا کہ یکتا نے لکھا ہے۔

"مخفی مباد کہ عرصۂ بعید و مدتِ مدید سپری گردیدہ کہ چہرۂ تطیر ایں مقالہ و گردہ تصویر ایں رسالہ بر صفحہ وجود نقش گرفتہ .... و سالہا سال بسر آمد ہرگز طبیعت متوجہ نشد کہ بنظر ثانی پرداز دیا آں کہ نحوی کہ منظور بود، درست سازد۔ کہ دوستی از دوستان فقیر مسمی بہ شیخ رمضان علی سلمہ از باشندگان لکھنو کمرہمت بہ نقلش پرداختند"

رسالے اور مقالے سے مراد صرف ورق ۳ الف سے ۱۸۷ الف تک ہے اور "نحوی کہ منظور بود درست سازد" سے مراد فہرست مضامین و خاتمہ و تصحیح و تحشیہ وغیرہ ہے اور اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ ہر مصنف کی طرح یکتا نے بھی متعدد مرتبہ مسودے میں کاٹ چھانٹ کی تھی۔ لیکن پھر بھی جیسی کہ چاہئے تصحیح نہ کرسکا تھا۔ اور آپ بھی نظر ثانی کو ص ۲۷ سطر ۱۵ میں تسلیم کرتے ہیں۔

یکتا کے اس مسودے میں ورق ۱۴۵ ب پر استفہام تقریری کی بحث میں میر سوز کا یہ شعر متن کے اندر مذکور تھا ؎

تو جو کہتا ہے، گلہ میرا کیا جس نس کنے کب کیا، کس جا کیا، کس وقت، کس دم، کس کنے

اس شعر کے محاذ میں حاشیے پر لکھا تھا" معلوم باد کہ شعر میر سوز مشتمل بر استفہام انکاری بود از سہو خود

در تقریری نوشتہ شدہ" شیخ رمضان علی نے اس کو جوں کا توں نقل کر لیا۔ اور اس عبارت کے بعد لکھ دیا "النقل کالاصل" چوں کہ کہیں شعر کو بے محل لکھا اور حاشیے پر خواہ مخواہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بیجا تکلف ہے۔ یکتا نے اس کو بہت مدت کے بعد محسوس کیا اور مبیضے میں دونوں عبارتیں کاٹ دیں۔

اگر یکتا پہلے ہی یہ کام کرتا یعنی مسودے میں اس شعر پر یہاں خط کھینچ کر اس کو استفہام تقریری کی مثال میں لکھ دیتا تو کس قدر زحمت سے بچتا۔ اب آپ فرماتے ہیں کہ مسودے میں یہ شعر استفہام تقریری کی بحث میں مذکور تھا۔ رمضان علی نے اس کو عین ہیں لکھ دیا۔ یکتا نے جب یہ مبیضہ دیکھا تو شعر کو کاٹ کر قصہ چکانے کی بجائے اس پر ایک نوٹ لکھا، یہ تمام عبارتیں ایک اور کاتب نے نقل کر لیں۔ یعنی "النقل کالاصل" اس دوسرے کاتب نے لکھا ہے اور جب یہ دوسری نقل یکتا نے دیکھی تو اس وقت اس نے وہی کام کیا جو وہ پہلے ہی کر سکتا تھا یعنی متن میں کا شعر اور حاشیے کا اپنا لکھا ہوا نوٹ اور دوسرے کاتب کا نوٹ سب کو قلم زد کر دیا۔ جو بات آپ دوسری نقل میں تسلیم کرتے ہیں اس کو پہلی ہی نقل میں تسلیم کر لینے میں کون امر مانع ہے۔

میرے قیاس میں ورق ۲۷ الف پر جو رباعی مسودے میں لکھی تھی اس کو رمضان علی نے ہو بہو نقل کر لیا۔ مصنف نے اس کو قلم زد کر کے دوسری رباعی حاشیے پر لکھ دی۔ اب آپ کے قیاس کے مطابق اس کی توجیہ یہ ہوگی۔ یکتا نے یہ رباعی مسودے میں لکھی تھی۔ شیخ رمضان علی کے مبیضے میں وہ نقل ہوگئی۔ یکتا نے جب اس مبیضے کو دیکھا تو رباعی میں ترمیم کا خیال نہ آیا۔ یہاں تک کہ وہ مبیضہ دوبارہ نقل ہو کر یکتا کے سامنے آیا۔ تب اس نے متن میں کی رباعی پر خط کھینچ کر حاشیے پر اصلاح شدہ رباعی رکھ دی۔

اگر میرا قیاس درست ہے تو ورق ۵۴ اب کے حاشیے پر جو نوٹ ہے اس کا اور متن کا ایک ہی خط ہونا چاہئے کیونکہ دونوں خط رمضان علی کے ہیں اور متن میں کسی اور جگہ خط نسخ میں کوئی تحریر ہے تو وہ بھی "النقل کالاصل" کے خط سے ملنا چاہئے لیکن حاشیے کی رباعی کا خط متن کے خط سے ضرور مختلف ہونا چاہئے کیونکہ یہ یکتا کی تحریر ہے۔

خاتمہ لکھے جانے کے بعد یکتا نے اس کو ہدایت علی المو ہانی سے لکھوایا۔ پھر یہ کتاب انقلاب زمانہ سے بہار پہنچی۔ اور وہاں سے مراد آباد ہوتی ہوئی رامپور آئی۔ شیخ رمضان علی نے جن وجوہ سے مسودے کی نقل کی ہے ان کے پیشِ نظر یہ بالکل غیر مناسب ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ آخر میں کاتب کی حیثیت سے اپنا نام لکھتا خصوصاً جب کہ مصنف خود احسان ماننے اور اعتراف کرنے کے لئے تیار تھا۔

اب ایک صورت یہ رہ جاتی ہے کہ حاشیے پر کی رباعی کا خط متن کی رباعی کے خط سے مختلف نہیں ہے تو دستور الفصاحت کا موجودہ نسخہ نہ شیخ رمضان علی کا لکھا ہوا ہے اور نہ اس میں کہیں یکتا نے اپنے ہاتھ سے اصلاحیں دی ہیں بلکہ کسی کاتب نے رمضان علی کے نسخے کو جس میں یکتا کی اصلاحیں تھیں ہو بہو نقل کر لیا تاکہ اس تصنیف کی ترقی کے مدارج محفوظ رہ جائیں۔ اور مصنف کی اس آرزو کے پیشِ نظر "بخوبی کہ منظور بودہ درست سازد" اگر کہیں کہیں متن کے اندر یا حاشیوں میں کتابتی غلطیوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے۔ تاہم متن میں بہت سی املائی غلطیاں باقی ہیں۔" ص۱۳

تو ماننا پڑتا ہے کہ یکتا کے قول و فعل میں یکسانی نہیں تھی اور وہ کوئی ذمہ دار اور محتاط مصنف یا مصحح نہیں تھا اور اختلافِ خطوط کی صورت میں یکتا پر کوئی اعتراض نہیں۔ ایک اور قیاس یہ باقی رہ جاتا ہے کہ جیسا کہ اشرف علی خاں فغاں کے مرتب کردہ انتخاب میں مرزا فاخر مکیں نے "جا بجا استادوں کے اشعار کو کہیں بے معنی سمجھ کر کاٹ ڈالا، کہیں تیغِ اصلاح سے زخمی کر دیا" تھا (آب حیات ص۱۶۵) اور جیسا کہ گلزار ابراہیم قلمی کے متن میں مصنف کے سوا کسی اور شخص نے بھی معتد بہ اضافے کئے ہیں (مآخذ حواشی ص۷) ویسا ہی ممکن ہے کہ دستور کے مخطوطے میں بھی کسی نے تصرفات کئے ہوں۔ اس صورت میں جب تک ہمیں یکتا کی کوئی اور تحریر نہ مل جائے یا کسی اصلاح کے نیچے ان کا دستخط نہ ہو۔ ساری قیاس آرائیاں صرف قیاس آرائیاں ہی رہیں گی اور آپ جس تفصیل سے دستور الفصاحت کے مخطوطے کا تعارف کرانا چاہتے ہیں اس کے لئے یہ لازم ہے کہ اس میں جتنے مختلف طرز کے خط ہیں ان کے کاتب معین کرنے کی کوشش کی جائے

تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ یہ مخطوط کن کن کے پاس سے اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا رام پور پہنچا ہے۔

دستور الفصاحت کے مختلف کاتبوں اور خطوں کی آپ نے جو بحث چھیڑی ہے اس کا قطعی فیصلہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ یہ نسخہ یا اس کے متعدد عکسی نسخے مختلف نقادوں کے پیش نظر نہ ہوں۔ اب جو کچھ بھی بحث ہوسکتی ہے اس کا انحصار آپ کی تحریر کے اس مفہوم پر ہے جو پڑھنے والے کی سمجھ میں آئے۔ اب اگر آپ کا بیان اس قدر مستقل ہے کہ پڑھنے والا وہی ایک بات سمجھنے پر مجبور ہے جو آپ سمجھانا چاہتے ہیں تو پڑھنے والے کی سمجھ میں بھی وہی بات آئے گی جو آپ نے سمجھی ہے۔ اور اگر عبادت پہلو دار ہوگئی ہے تو پڑھنے والا نہ تو نسخے کی اصل کیفیت ہی سمجھ سکتا ہے اور نہ آپ نے جو سمجھا ہے وہی معلوم کرسکتا ہے۔ یعنی ساری بحث کا اصل کتاب سے وہی تعلق ہے جو آپ کی تحریر کا اس سے ہے۔

دستور کے اختتام کی تاریخ	طـ۲۶ " ان پانچ شہادتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب سنہ ۱۲۲۹ھ اور سنہ ۱۲۳۰ھ کے درمیان تمام ہوچکی تھی" حالانکہ ان کی چار شہادتیں (قتیلؔ

شاہ نصیرؔ، میر تقیؔ، مرزا جعفرؔ) خاتمے یعنی تذکرۃ الشعرا سے متعلق ہیں اور مقدمے میں جو مرزا جعفر کا نام آیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے۔

مقدمہ صـ۳۔ مرزا جعفر کے نام کے بعد "مغفور اندلا زال دولتہ واقبالہ" لکھا ہے اور کوئی دعا قلم زد نہیں اسی صفحے پر مرزا حاجی کے نام کے ساتھ دام اقبالہ ہے۔

خاتمہ صـ۱۰۲، مرزا جعفر کے نام کے بعد "دام اقبالہ اور مغفور ومرحوم ہر دو اور دام اقبالہ قلم زد ہے۔

خاتمہ صـ۱۱۱ شاہ نصیر کے احوال میں مرزا حاجی کے لئے نہ کوئی القاب ہے نہ کوئی دعا۔ لیکن اس کا اقتباس جو آپ نے دیباچے کے صـ۱۵ لکھا ہے اس میں " دام اقبالہ" موجود ہے۔

خاتمہ صـ۱۲۱ مرزا حاجی کے نام کے بعد " دام ظلہ واقبالہ" اور مرزا جعفر کے نام کے بعد "دام اقبالہ" لکھا ہے

خلاصہ یہ کہ مرزا حاجی کی وفات ۱۲۷۵ھ میں ہوئی اور دستور پر نظر ثانی ۱۲۴۹ھ میں، اس لئے ان کے نام کے ساتھ مغفرت کی دعا کیوں کر آسکتی تھی اور جس وقت رمضان علی نے اس کی نقل لکھی مرزا جعفر مر چکے تھے اور جہاں کہیں مرزا جعفر کا نام آیا ہے اور جو تعریفی اور توصیفی لفظ استعمال ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان کی زندگی میں لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے سب جگہ ان کی درازیٔ عمر کی دعا آئی ہے اس لئے یا تو سب جگہ دعائے مغفرت لکھی جانی چاہئے تھی یا کہیں نہ لکھی جاتی۔ اب ایک جگہ دونوں دعائیں بحال ہیں (خاتمہ ص۲) ایک جگہ صرف دعائے مغفرت بحال ہے (ص۱۰۲) اور ایک جگہ صرف دعائے زندگی (ص۱۲۱) تو یہ سب شیخ رمضان علی کی کتابت اور یکتا کی تصحیح نقل میں مسامحت کے کرشمے ہیں۔ البتہ جہاں دعائے بقا قلمزد کرکے دعائے مغفرت بڑھائی گئی ہے وہاں خط کے اختلاف سے ان کے لکھنے والوں کا پتہ مل سکتا ہے۔

ص۲۷ "ان دونوں شہادتوں سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۳ھ سے پہلے تالیف ہو چکی تھی" یہ شہادتیں احسن اللہ بیان اور قائم کے متعلق ہیں اور ان کا تعلق بھی تذکرۂ شعرا سے ہے نہ کہ (قواعد صرف و نحو، عروض و قافیہ و معانی و بیان و بدیع) اصل کتاب سے۔ اور اس تذکرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو یکتا نے ۱۲۱۳ھ سے پہلے ارادی یا غیر ارادی طور پر لکھنا شروع کر دیا تھا اور برابر لکھتا رہا یہاں تک کہ ۱۲۳۰ھ و ۱۲۳۹ھ کے بعد ہی اس کو ختم کر دیا گیا۔ تذکرے میں جن شعرا کا تذکرہ ہے ان کی موت و حیات سے تذکرے کی ابتدا اور انتہا کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

بیان کی وفات اگر ۱۲۱۳ھ میں ہوئی ہے اور تذکرے میں اس کو "تا حال زندہ است" لکھا ہے تو اس سے صرف اتنا نتیجہ نکلتا ہے کہ بیان کی وفات اگر ۱۲۱۳ھ میں پہلے قلمبند ہوئی تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ اس سنہ میں تذکرہ ہی ختم کر لیا گیا تھا۔ اور پھر ۱۲۱۳ھ کی بنا پر یہ کہنا کہ "دستور الفصاحت" کی تالیف کا کام انشا کی دریائے لطافت سے پہلے (۱۲۲۲ھ)

انجام پاچکا تھا" ص۲۷ اور یہ کہ مصنف کی نظر میں دریائے لطافت کا نہ ہونا اس بنا پر تھا کہ یہ ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی" ص۲۷ خود یکتا کے اس جملے کے ہوتے "غواص بحرِ فصاحت" صاحب دریائے لطافت" ص۱۰۳ خاتمہ حقیقت سے بعید ہے۔

یکتا کے اس جملے میں دو باتیں اظہر من الشمس ہیں۔ (۱) انشا کا احوال تذکرۃ الشعرا میں سنہ ۱۲۲۲ء کے بعد لکھا گیا ہے یا کم از کم یہ ٹکڑا اس سنہ کے بعد بڑھایا گیا ہے (۲) انشا دریائے لطافت کے مصنف کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہو چکے تھے کہ ان کے نام کے ساتھ اس تصنیف کا ذکر لازمی ہو گیا تھا۔ یکتا کو اتنی بھی رعایت حاصل نہیں ہو سکتی کہ اس نے یہ سن کر کہ یمین الدولہ نے انشا کو قواعد و مصطلحات زبانِ اردو لکھنے کا حکم دیا ہے۔ خود بھی انھیں مرتب کرنے لگ گیا ہو۔ کیونکہ دستور کا مقدمہ دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یکتا نے دریائے لطافت کے مقدمے اور دروازہ اول و دوم و سوم اور باغ در ذکر فوائد دیگر کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ دریائے لطافت فارسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو کے صفحوں کے حوالے سے چند ہم مطلب مقام درج ذیل ہیں۔ ان کی مطابقت سے ان تصانیف کی تقدیم و تاخیر واضح ہو جائیگی توارد کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

متحد مضامین	دستور	دریا
فردوسِ آرامگاہ	۶	۳۷
سودا	۶	۲۲
مرزا جان جاناں	۶	۱۷
ستی	۷	۳۴
خنجر	۷	۷
تعریف محاورہ ولفظ و تعریف اردو	۹	۳۷
دلی		۲۴۱
سفیل	۹	۲۴۲

پھر بھی اگر کلیتاً فرماتے ہیں کہ "ہیچ کتابی از کتب ایں فن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در نظر نداشتم الخ" تو اس کی صداقت بھی قائم کے اس قول سے کہ "الی الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابی تصنیف نگردیدہ" ملتی جلتی ہے۔

ص۲ "ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب میر انشاء اللہ خاں انشا کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو مرزا قتیل کی مدد سے ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں تمام ہوئی تھی" مجھے اس جملے کے خط کشیدہ حصے سے اتفاق نہیں۔ دریائے لطافت بلاشبہ من حیث الکل قتیل کی مدد سے لکھی گئی ہے لیکن قواعدِ اردو اور مصطلحات زبانِ اردو میں قتیل کا کوئی حصہ نہیں۔ انشا نے ازراہِ کسرِ نفسی اپنی فارسی عبارت تک میں اصلاح دینے کا قتیل کو اختیار دیا ہے لیکن وہ اس کے روادار نہیں کہ قتیل قواعد و مصطلحات زبان اردو میں کوئی ادنیٰ سا تصرف بھی کرے مرشد آبادی نسخے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"ایں ہمہ فرصت بدست نیامد کہ تنہا رنگ بر چہرۂ ایں نقش بدیع کشم مرزا محمد حسین قتیل را نیز کہ روکردۂ ادبے تامل رو کردۂ من و پسندیدۂ او پسندیدۂ ایں کر بمر زبان بودہ است واز صغر سن میانۂ من و او رادر ہر چیز حصۂ برادرانہ قرار پذیرفتہ شریک ایں دولت ابد مدت ساختم و باہم چنیں مقرر شد کہ خطبۂ کتاب ولغت ومحاورہ اردو ہر چہ صحت و سقم آں باشد و مصطلحات شاہجہاں آباد و علمِ صرف و نحو ایں زبان را راقم مذنب یعنی کمترین بندۂ درگاہ آسماں جاہ انشا بنویسد۔ و منطق و عروض و قافیہ و بیان و بدیع را او بقید قلم در آورد و چوں بندہ را بیشتر با نظم سروکار ماندہ و او را با نظم و نثر ہر دو چند سطری کہ می نویسم نگاہداشتن آن نیز موقوف بر پسند او ست۔ سوائے لفظ و محاورہ و اصطلاح اردو دخلش در عبارت ہمہ مقبول خاطر فقیر گشتہ۔"

اس لحاظ سے یہ کہنا کہ قتیل نے ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب لکھنے میں انشا کی مدد کی۔

حقیقت کے خلاف ہے"

اصل کتاب کی وجہ تصنیف | بعضے عزیزان و شفیقان بنوشتن قواعد صرف و نحو وغیرہ بطرزیکہ

اجرای آنہا بزبانِ ہندی موافق محاورۂ اردو بودہ باشد اکثر تکلیف می کردند۔ و راقم

چوں قدرت تحریر آں بمرتبہ کہ پایہ ایں اعتبار را شاید در خود نمی دید۔ متامل بود کہ دریں اثنا

. . . . . . مرزا حاجی صاحب . . . . . نیز باصرار فرمودند۔ ناچار امتثا لاً

للامر بتسوید رسالہ پرداختم۔ و ہر قدر کہ نوشتم قواعد مسطور از فارسی نقل نمودہ بہ ہندی

مطابق ساختم۔ پس مسمیٰ گردانیدم مجموعۂ مذکورہ را بہ "دستور الفصاحت" و مرتب نمودم

ترتیبش را بمقدمہ و پنج باب و خاتمہ"۔

مقدمے کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جوہر شناس احباب مدت سے تقاضا کر رہے تھے کہ یکتا قواعد صرف و نحو اردو پر نہ کہ احوال شعرا پر ایک رسالہ لکھے لیکن وہ کسر نفسی سے اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ مرزا حاجی نے بھی اصرار کے ساتھ اس تصنیف کی فرمایش کی تو یکتا نے مجبور ہو کر اس کو لکھنا شروع کیا" ناچار امتثا لاً للامر بہ تسوید رسالہ پرداختم" اور قواعد اردو کو قواعدِ فارسی کے سانچوں میں ڈھالنے لگا۔ ان مراحل کے بعد اس نے اس کتاب کا نام "دستور الفصاحت" رکھا۔ پس مسمیٰ گردانیدم مجموعۂ مذکور را بہ دستور الفصاحت"۔

یعنی کتاب کے مطالب یکتا کے ذہن میں خواہ کتنی ہی مدت سے رہے لیکن اس نے انھیں ۱۲۲۹ھ یا ۱۲۳۰ھ میں مرزا حاجی کے حکم سے قلمبند کرنا شروع کیا۔ پھر جب اس کا خاکہ تیار ہو گیا تو کئی وجوہ سے سالہا سال تک حسب دلخواہ نظر ثانی کر کے اس میں رنگ بھرنے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔

"عرصۂ بعید و مدتِ مدید سپری گردیدہ کہ چہرۂ تسطیر ایں مقالہ و گردۂ تصویر ایں رسالہ بر صفحہ وجود نقش گرفتہ بہ سبب تردد خاطر . . . در محل تعطل افتادہ بود۔ و دریں تعطیل کہ سالہا سال

بسر آمدہ ہرگز طبیعت متوجہ نشد کہ بنظر ثانی پردازد یا آں را بنحوی کہ منظور بود درست سازد"

یعنی انیس برس تک یہ کتاب مسودے کی حالت میں رہی اور ۱۲۴۹ھ میں اس کا تاریخی نام رکھا گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حاجی کے حکم سے جب کتاب لکھی جانے لگی تھی تو "قواعد صرف ونحو اردو" کے سوا کوئی اور نام مصنف کے ذہن میں نہیں تھا۔ اگر بقول آپ کے یہ کتاب ذہنی طور پر نہیں بلکہ خارجی طور پر ۱۲۱۳ھ سے پہلے تالیف ہو چکی تھی تو یکتا نے اپنے اس بیان میں کہ "ناچار امتثالاً للامر بہ تسوید رسالہ پرداختم" صریح جھوٹ کہا ہے اور آپ یکتا کو اس مقام میں جھوٹا تسلیم کرلیں جو ناگزیر ہے تو پھر آپ اس کی کس بات کی حمایت میں دلائل پیش کر سکتے ہیں۔

رقعات قتیل "معدن الفوائد" سے پتا چلتا ہے کہ دریائے لطافت کی متعدد نقلیں لکھی جا چکی تھیں اور یہ امر ناممکن ہے کہ آٹھ برس (۱۲۲۲ - ۱۲۳۰) بلکہ ستائیس برس (۱۲۲۲ - ۱۲۴۹) کے عرصے میں باوجود اس شہرت اور اعتراف شہرت کے یکتا نے دریائے لطافت کا مطالعہ کرنا ضروری نہ خیال کیا ہو اور یوں خیال کرنا یکتا پر ظلم کرنا ہے۔ علاوہ یکتا کے اس بیان کے۔

"ہیچ کتابی از کتب ایں فن ورسائل ایں ہنر کہ مفید مطلب ومعین مقصد دریں باب می شد درنظر نداشتم کہ موافق آں می نوشتم واز خطا مصئون می ماندم"

یہ معنی کہاں نکلتے ہیں کہ یکتا نے اس فن صرف ونحو اردو کی سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں دیکھی تھی یا کوئی ایسی کتاب معرض وجود ہی میں نہ آئی تھی بلکہ یکتا کا کہنا یہ ہے کہ "اس فن پر ملکیوں اور غیر ملکیوں کی کتابیں تو بہتیری ہیں مگر میں جس طرز پر لکھنا چاہتا تھا اس طرز کی یا اس پائے کی کہ میں اس سے استفادہ کروں یا اس کے نقش قدم پر چل کر غلطیوں سے محفوظ رہوں کوئی کتاب میری نظر میں نہیں تھی" اُس نے صاف صاف لکھا ہے کہ۔

"اس فن کی کتابوں میں سے کوئی کتاب یا اس ہنر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ جو

اس بارے میں مفید مطلب ہو و معین مقصد ہو میری نظر میں نہیں تھا کہ میں اسی کے موافق لکھتا اور غلطیوں سے محفوظ رہتا۔"

کسی فن کی کتابوں اور رسالوں کو دیکھے بغیر ایک مصنف کیسے کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی مفید مطلب اور معین مقصد نہیں، پھر کسی فن پر اس فن کی کتابوں سے جو پہلے سے موجود و مشہور ہیں آنکھیں بند کر کے لکھتے چلے جانا اور یہ سمجھنا کہ بس قواعد صرف و نحو اور دو میرے ہی افکار کے محتاج ہیں جہالت ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یکتا نے ایسا دعوی نہیں کیا۔ بخلاف اس کے قائم کی ڈھٹائی قابلِ داد ہے۔ کس دلیری سے لکھتا ہے۔

"الی الآن در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابی تصنیف نگردیدہ، و تا ایں زماں ہیچ انسانی از راہ جرای شوق افزای سخنوراں ایں فن سطری تالیف نرسانیدہ۔"

اب یکتا نے جو یہ کہا ہے کہ دریائے لطافت بھی دستور فصاحت کی تصنیف میں مفید و معین نہ ہو سکی یا یہ کہ دستور بہ نسبت دریا کے بہت جامع اور فنی کتاب ہے اس کی تصدیق یا تکذیب دنیائے ادب اسی وقت کر سکتی ہے جب اس کے سامنے پوری کتاب چھپ کر آئے اور وہ بذاتِ خود اس پر کوئی رائے قائم کر سکے۔ اب اس پر جو کوئی بھی جو کچھ بھی رائے قائم کرے گا اس کی بنیاد آپ کی رائے پر ہو گی۔

خاتمے کی وجہ تصنیف | "خاتمہ در تذکرۃ الشعرا یعنی در بیان اسامی و قدری احوال بعضی از شعرا کہ بتقریب مثال۔ کلام فصاحت نظام ایں بزرگواران دریں رسالہ مندرج گردیدہ تا مطالعہ کنندہ را از حالت و قوت مرتبہ ہر یک فی الجملہ وقوف و آگہی بودہ باشد"

اصل تصنیف سے خاتمے کا صرف اتنا تعلق ہے کہ اس کے پڑھنے سے اصل تصنیف میں جن شعرا کے اشعار مثال کے طور پر آئے ہیں، ان میں سے بعض کے رتبے اور حالات معلوم ہوتے ہیں

یکتا نے یہ نہیں لکھا کہ اس نے کب سے اور کس کے حکم سے یہ تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ اندرونی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ ایک مدت سے بہ طور خود تذکرۃ الشعرا مرتب کر رہا تھا۔ اس کا آغاز ۱۲۱۳ھ سے پہلے ہی ہو چکا تھا اور ۱۲۴۹ھ تک اس میں برابر ترمیمات اور اضافے کرتا رہا۔ اسی کا ایک انتخاب بطور خاتمے کے دستور کے آخر میں ملحق ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا کا اصل کتاب قواعد صرف و نحو اردو کی ابتدا اور انتہا سے کوئی تعلق نہیں اور یہ دونوں مستقل اور مختلف تصانیف ہیں۔

جس شاعر نے جس قدر اردو کی خدمت کی ہے اور اس کی نشو و نما میں حصہ لیا ہے۔ اسی تناسب سے ہمیں اس کے سوانح زندگی کی تلاش رہتی ہے۔ خدمت اردو کا درجہ اول ہے اور احوال زندگی کا ثانوی۔ ہم میر تقی میر کو اس لئے عزیز نہیں رکھتے کہ وہ خان آرزو کے بھانجے تھے یا خود آصف الدولہ نے انھیں لکھنؤ طلب کیا تھا یا وہ اپنے اور سودا کے سوا کسی کو پورا شاعر نہ مانتے تھے۔ بلکہ ان کا کلام ان کے کمالات شاعری کا شاہد عادل ہے اور اسی کے ضمن میں ہم اُن کی شاعری کو قابل مطالعہ سمجھتے ہیں اور اپنے عزیز اوقات کو اس میں صرف کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ورنہ وہ خان آرزو کے بھانجے تو کیا نوح علیہ السلام کے بیٹے بھی ہوتے تو انھیں کون پوچھتا اور کون اس کی تحقیق کرتا کہ دلی سے لکھنؤ جاتے وقت میر کے پاس ساری گاڑی کا کرایہ تک تھا یا نہیں۔ وہ لوگوں سے کم التفاتی و بے اعتنائی سے پیش آتے تھے یا لجاجت اور چاپلوسی سے اور وہ اپنی کمر میں پستولے کا ایک پورا تھان لپیٹ لیتے تھے یا رسی باندھ لیتے تھے اور اسی طرح انشا نے جو کچھ بھی اردو کی خدمت کی ہے اگر وہ نہ کی ہوتی تو کون اس کی پروا کرتا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تالیف "انشا" پر انشا کی جو تصویر بنی ہے اس میں سر پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ حال آنکہ تکملۃ الشعرا کے مولف نے جو انشا کا معاصر تھا لکھا ہے "بطور آزاداں باصفائی چہارابرومی ماند" تو ان دونوں میں کون مستند ہے۔ یا یہ کہ انشا آخری وقت میں مجنوں ہو گئے تھے یا مجذوب و علی ہذا القیاس۔ یہ سب ذیلی اور ضمنی باتیں ہیں۔ تحصیل زبان و ادب میں ان باتوں کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی

کوئی گھٹاؤ یا بڑھاؤ نہیں ہوتا۔ آج دنیائے اردو میں افسانوں کی ہوا چل رہی اور ہر ادیب ارادی یا غیر ارادی طور پر اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس لئے شعرا کی سوانح عمریاں پڑھنے میں جو لطف آتا ہے وہ ان کے کلام کی خصوصیات اور اردو پر ان کے احسانات کے فنی مطالعہ سے نہیں آتا۔

جرأت معاف۔ دستور الفصاحت کے دو حصے ہیں پہلا ایک سو تاسی صفحے کا نادر اور قیمتی تحقیقات کا خزانہ اور دوسرا اس خزانے کے بعض نادر روزگار طلائی سکوں کی تفصیلات کا صرف بتیس صفحوں کا خاتمہ۔ آپ نے دنیائے اردو کو خزانے سے محروم کر کے صرف اس کی تفصیلات کے خاتمے کو مزید نایاب و کمیاب تفصیلات کے ساتھ شائع کر دیا۔ یکتا کی ہمیں ایک تصنیف مل گئی۔ اس کے حالات نہیں ملے۔ خیر زبان و ادب کا کوئی معتدبہ نقصان نہیں ہوا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا یعنی یکتا کے صرف حالات ملتے اور تصنیف نہ ملتی تو کس قدر نقصان اور افسوس ہوتا۔

ماخذ حواشی میں جو چوراسی صفحے کھپے ہیں ان میں چھوٹے ٹائپ میں اصل کتاب کے ۱۸۷ صفحے سما جاتے۔ یہ صفحے آپ نے جس دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے لکھے ہیں اس محنت شاقہ کی داد کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھوں نے اس قسم کے کام کئے ہیں۔ یہ حصہ اس قابل تھا کہ تذکرۂ تذاکیر الشعرا کے نام سے علیحدہ شائع کیا جاتا۔ یہ ایک مستقل اور ضخیم تالیف ہو سکتا ہے اور بہت ہی صبر شکن اور حوصلہ آزما کام ہے۔

دنیا اردو داں شعرا کے حالات سے اگر کما حقہٗ بے خبر نہیں تو تھوڑا بہت پہلے سے واقف تھی ہی۔ آپ نے اس معلومات میں اور اضافہ کیا۔ یہ بیشک آپ کا احسان ہے لیکن احسانِ عظیم ہوتا اگر آپ اس نایاب حصے کو جس سے دنیائے اردو مطلق واقف نہیں ہے شائع کر دیتے۔

دریائے لطافت اور قتیل

میں خواص کا ذکر نہیں کرتی متوسط بلکہ اس سے کچھ اونچے درجے کے ادبا میں کتنے ایسے ہوں گے جنھوں نے دریائے لطافت کا مکمل نسخہ دیکھا ہے اور اس کے دیباچے کو جس کا اقتباس میں نے اوپر لکھا ہے بغور پڑھا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ دریائے لطافت

میں یہ اہم قواعد اردو کی کتاب انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو مرزا قتیل کی مدد سے ۱۲۲۲ھ میں تمام ہوئی تھی۔" مدد کے لفظ سے ہر اس عبارت کو پڑھنے والے کا دماغ قواعد اردو کی تدوین میں قتیل کی مدد کی طرف منتقل ہوگا۔ میری دانست میں اس عبارت میں یہ ترمیم ہونی چاہئے۔

"ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اردو کی کتاب میر انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت شمار کی جاتی ہے جو ۱۲۲۲ھ میں تمام ہوئی تھی۔ اس میں منطق و عروض و قوافی و معانی و بیان پر جو ابواب ہیں وہ مرزا قتیل نے لکھے ہیں۔"

مدد یا شرکت کا لفظ بہت ہی مغالطہ انگیز ہے مثلاً "حضرت جوش نے مولانا حسرت کی مدد یا شرکت سے منتخب نظموں اور غزلوں کا ایک گلدستہ شائع کیا ہے" تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہر غزل کے انتخاب میں حضرت جوش اور ہر نظم کے انتخاب میں مولانا حسرت کی صلاح اور مشورے کو دخل ہے۔ حالانکہ کہنے والے کا مقصد یہ ہے کہ

"حضرت جوش نے منتخب نظموں اور غزلوں کا ایک گلدستہ شائع کیا ہے جس میں غزلوں کا انتخاب مولانا حسرت نے کیا ہے۔"

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا "قواعد اردو کی کتاب موسومہ بہ دریائے لطافت کی تالیف میں قتیل شریک تھے یا وہ ان کی مدد سے لکھی گئی؟" ذمہ دار تحریروں میں کوئی ایسے جملے جن میں ابہام ہو کیوں باقی رہیں۔

ماخذ حواشی میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تذکروں میں جو سنہ آغاز و اتمام لکھا جاتا ہے وہ محض برزخی کیفیت رکھتا ہے اور تذکرے کا حقیقی آغاز و اتمام۔ اس سے بہت قبل اور بعد ہوتا ہے مثلاً مجمع النفائس کے اختتام کا سنہ ۱۱۶۴ھ لکھا گیا ہے حالانکہ اس کی تالیف کا زمانہ اندرونی شواہد کے مطابق سنہ ۱۱۵۴ھ سے سنہ ۱۱۶۴ھ تک کا ہے اور واقعی آپ نے اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

مجمع النفائس کے آغاز کے متعلق حزیں کے حالات سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کی ترتیب ۱۱۵۴ھ سے پہلے سے ہونے لگی تھی اور آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مصنف (آرزو) نے دیباچے میں یہ بھی بتایا ہے کہ انھیں اس کی ترتیب کا خیال کس طرح اور کب ہوا" اگر مصنف کی یہ عبارت بھی شائع ہو جاتی تو آپ کی تحقیق کی مزید تائید ہو جاتی۔

کسی تذکرے کا آغاز و انجام معین کرنے کے لئے صرف دو امور اہم ہیں۔ ایک یہ کہ مولف نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو کب تذکرے کی صورت دینے کا ارادہ کیا اور دوسرا یہ کہ اس نے اپنے تذکرے کو پہلے پہل کب قابلِ اشاعت سمجھا۔

مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو طالب علمی کے زمانے سے اساتذۂ فارسی کے منتخب اشعار ایک بیاض میں لکھنے لگے صرف اپنی دلچسپی کے لئے نہ کہ اشاعت کی غرض سے۔ شدہ شدہ وہ ایک اچھا خاصا نادر اور انمول ذخیرہ بن گیا تو انھیں بطورِ خود یا دوستوں کے اصرار سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس علمی خزانے کی افادی حیثیت سے دوسروں کو کیوں محروم رکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو منظم اور مرتب طور پر شائع کرنے کا قصد کر لیا۔ اور یہی زمانہ اس تذکرے کے آغاز کا ہے ممکن ہے کہ اس سنہ آغاز سے بیس سال پہلے اس بیاض کی ابتدا ہوئی ہو لیکن وہ مدت معتبر نہیں۔ ورنہ یوں کہنا غلط ہو گا کہ زید ۱۹۴۲ء میں بی اے کی جماعت میں داخل ہوا اور دو سال کا نصاب ختم کر کے ۱۹۴۴ء میں بی اے پاس ہوا۔ کیونکہ بی اے کی جماعت میں داخلے کے لئے اس کو تیرہ سال پہلے سے تیاری کرنی پڑی تھی اور آج تک وہ برابر ان مسائل کی تحقیق میں ہے جنھیں وہ دو سال کے عرصے میں امتحانی نقطۂ نظر سے سمجھ تو چکا تھا، لیکن حل نہ کر سکا تھا اور یوں کہنا حقیقت کے خلاف ہو گا کہ وہ ۱۹۲۹ء سے بی اے کی جماعت میں داخل رہا تھا اور اب امتحان پاس ہو جانے کے بعد بی۔ اے کے درجے کی جو معیاری لیاقت ہے وہ جامع اور مانع طور پر زید کو حاصل ہو چکی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خوش نصیب سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں بی اے پاس کر لیتا ہے محض اس لئے کہ قدرت نے اسباب فراہم کئے تھے اور وہ امتحانات پاس ہوتا ہی چلا گیا اور کوئی دھن کا پکا بڑی عمر میں بی اے ہونے ہی کے قصد سے ابتدائی مراحل طے کرتا ہے۔ اگرچہ یہ تمثیل بیش پا افتادہ ہے لیکن میرا مفہوم اور تذکروں کے مولفین کا حال اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

آرزو دیباچے میں لکھتے ہیں کہ مجھے فلاں سنہ میں (؟) تذکرے کی ابتدا کا خیال پیدا ہوا تو وہی اس کے آغاز کا سنہ ہے خواہ اس سے پہلے کے کسی سنہ کے کسی واقعے کا ذکر مولف نے بصیغۂ حال کیا ہو۔ لیکن مولف اگر آغاز کا صراحتاً یا کنایتہً ذکر کرے تو تذکرے میں جن مختلف زمانوں کا حال ملتا ہے۔ ان میں سب سے مقدم زمانے کو آغاز کا زمانہ قرار دینے کے لئے یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم اس مولف کے سوانح حیات سے بخوبی واقف ہوں کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا۔ تعلیم و تربیت کہاں پائی۔ اس کے طبعی رجحانات اور مشاغل زندگی کیا تھے۔ تلاشِ معاش میں کہاں کہاں کا سفر کرنا پڑا۔ تصنیف و تالیف کے لئے جس آسودگی اور سکون کی ضرورت ہے وہ اس کو عمر کے کن زمانوں میں میسر ہوئی۔ اس تذکرے کی تالیف کے محرکات کیا تھے وغیرہ۔

اب رہی تاریخِ اختتام وہ بلاشبہ وہی رہے گی جو مولف نے لکھی ہے اس میں کوئی تبدیلی روا نہیں۔ پہلے زمانے میں طباعت کی سہولتیں نہ تھیں اس لئے تذکرہ ختم ہو جانے کے بعد بھی مولف ہی کے پاس دھرا رہتا تھا اور صرف خاص خاص لوگوں کی نظروں سے گزرتا تھا۔ ایک آدھ شائق کو اس کی نقل لینے کی اجازت ملتی بھی تھی تو وہ نقل اصل تذکرے کی ضخامت کے لحاظ سے ہفتوں اور مہینوں میں پوری ہوتی تھی۔ یہ ضروری ہے کہ ہر تالیف میں کچھ کمیاں رہ گئی ہیں یا بعض مقام تفصیل یا اختصار چاہتے ہوں مولف انھیں وقتاً فوقتاً درست کرتا رہتا تھا۔ یہ گویا ہر تذکرے کے کئی ایڈیشن ہیں مثلاً آبِ حیات کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں نکلا اس میں میر ضاحک اور مومن کے حالات نہیں تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں

یہ بڑھائے گئے تو یہ کہنا کہ ۱۸۸۸ء میں یہ تذکرہ ختم نہیں ہوا تھا اور اس کا سال اختتام اس سنہ کے بہت بعد ہے حقیقت نہیں۔

دستور الفصاحت کی آئندہ اشاعتوں میں آپ ترمیمات اور اضافے کرتے ہی جائیں گے لیکن اس کا سالِ اختتام یعنی اشاعتِ اول کا سنہ وہی ۱۹۴۳ء رہے گا اور حق یہ ہے کہ کوئی مولف یا مصنف اپنی تالیف یا تصنیف ختم کر لینے کے بعد اس میں جو عبارتیں گھٹاتا اور بڑھاتا ہے وہ اس کی انصاف پسندی اور اصابت رائے کی کسوٹی ہوتی ہیں اور اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کوئی مولف اپنے ماضی اور اپنے زمانے سے کس قدر گہری اور سطحی واقفیت رکھتا ہے اور اگر ہم کسی تذکرے کے اختتام کا سنہ اس میں کے آخری اضافے کے سنہ کو مان لیں تو نفسیاتِ انسانی کا ایک اہم باب حذف ہو جائے گا کہ وہ کس طرح اپنی سعی کو کسی خاص درجے پر پہنچکر مکمل تصور کر لیتا ہے اور امتدادِ زمانہ اس فیصلے کو نظرِ ثانی کا محتاج ثابت کر دیتا ہے۔

زمانے میں تذکروں کی اس نہایت ہی محدود اشاعت سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ مولف جس کے بارے میں جو جی چاہتا تھا لکھتا تھا اور کوئی معارض نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پورا زمانہ گزر جاتا تھا۔ متاخرین کو اگر مولف اور اس کی تحریروں کے متعلق کافی ذخیرہ معاصرین کا لکھا ہوا مل جاتا ہے تو آسانی ہو جاتی ہے ورنہ وہ وثوق کے ساتھ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ایک اور مشکل یہ ہے کہ جب تک مولف کی شخصیت ایسی نہ ہو کہ اس کے قلم سے نکلا ہوا لفظ لفظ سند بن جانے کا امکان رکھتا ہو تو معاصرین اس سے تعرض بھی نہیں کر سکتے۔ اور اگر کریں بھی تو جب تک خود معترض یا اس کے معاصران اعتراضات کو قلم بند نہ کریں وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کسی ایسے تذکرے میں جس کا معاصرین نے ذکر نہیں کیا اور جس کو مولف اور اس کے کرانا کاتبین کے سوا کوئی چوتھا نہیں جانتا تھا کسی مانی ہوئی بات کے خلاف کوئی امر لکھا ہو تو ایک سو سال کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر یہ امر

واقعہ نہ ہوتا تو اسی زمانے میں لوگ اس دروغ بیانی کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیتے۔

عوام میں مشہور ہے کہ لوگ خود مشہور ہو جانے کے لئے کسی مستند شخص پر تنقید کر دیتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ حقیقی شہرت کا سودا اگر اس قدر سستا بک سکتا ہے تو اس میں زبان اور ادب کا کوئی نقصان نہیں۔ سراسر نقصان تو اس امر میں ہے کہ کوئی غلط بات ایک مستند شخص کے قلم اور زبان سے نکل کر صحیح مشہور ہو جائے لیکن تاریخ زبان و ادب گواہ ہے کہ ہر دور میں بعض مشاہیر کی شخصیتیں اس قدر "تنقید سہار" ہوتی ہیں کہ ان کے معاصرین کی معقول سے معقول تنقید بھی ان کے فیصلوں کو بدل نہیں سکتی اور وہ آئندہ نسلوں پر اس کا فیصلہ چھوڑ جاتے ہیں کہ مملکت علم میں یہ "اٹل پن" بغاوت تھا یا خروج۔

آپ نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے دو جگہ اختلاف کیا ہے۔

(۱) ڈاکٹر اسپرنگر یہ قیاس کرتا ہے کہ نکات الشعراء کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اسے تسلیم فرمالیا ہے (دیباچہ صفحہ ۴۳)

(۲) صاحب گلزار کی تاریخ وفات ڈاکٹر اسپرنگر اور بلوم ہارٹ نے ۱۲۰۸ھ بتائی ہے۔ مخدومی مولوی عبدالحق صاحب نے بھی گلشن ہند کے مقدمے میں اسی سنہ کو دہرایا ہے۔ اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو الخ (دیباچہ صفحہ ۷۸)

"تسلیم فرمالیا ہے" اور "دہرایا ہے" کے یہ معنی ہوئے کہ انھیں اسپرنگر کے ان فیصلوں کو تسلیم نہ فرمانا اور نہ دہرانا چاہئے تھا۔ لیکن نکات الشعراء کے متعلق آپ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ "میر صاحب نے یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۱ھ میں یا اس کے کچھ بعد لکھنا شروع کیا اور شعبان ۱۱۶۵ھ کے قبل ختم کیا" تو مولوی صاحب پر صرف اتنا اعتراض ہو سکتا ہے کہ انھوں نے "سنہ اختتام" کی بجائے "سنہ تالیف" کا لفظ استعمال کیا جو سنہ آغاز و انجام دونوں پر حاوی ہے اس لئے دھوکا ہوتا ہے کہ میر نے اسی سنہ

میں تذکرہ شروع کرکے اسی سنہ میں اس کو ختم کردیا تھا لیکن مولوی صاحب نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ کسی کتاب پر میرے رائے دے چکنے یا اس کتاب پر کسی کی رائے کی تصدیق کر چکنے کے بعد تحقیق کا دروازہ بند ہے اور کسی کو مزید تحقیق کا مجاز نہیں۔

ہم مولوی صاحب سے غلطیوں کا وقوع محال کیوں فرض کرلیں جو ہم کو ان کی کسی غلطی پر تعجب ہو۔ جیسا آج اردو کا ہر محقق آزاد کی آبِ حیات پر کوئی اعتراض ضروری سمجھتا ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب پر کوئی ایراد ضرور کرتا ہے۔ انھوں نے تاریخ ادبِ اردو میں بے شمار صحیح معلومات کا انکشاف کیا ہے کہیں کہیں غلطیاں بھی ان سے ہوئی ہیں۔ لیکن انھیں بطریقِ احسن رفع کرنا ہمارا فرض ہے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی تحقیق پیش کرنے سے پہلے اگر صرف اسی قدر لکھتے تو کافی تھا کہ "ڈاکٹر اسپرنگر اور مولوی عبدالحق صاحب یہ قیاس کرتے ہیں کہ نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے اور صاحب گلزار کی وفات اسپرنگر اور بلوم ہارٹ اور مخدومی مولوی عبدالحق صاحب نے ۱۲۰۸ھ بتائی ہے۔

مولوی صاحب پر جو دوسرا اعتراض ہے اس میں صاحب گلزار کی تاریخ وفات ۱۲۰۸ھ کے صحیح نہ ہونے میں آپ کو جو شبہے ہیں ان کے وجوہ نہیں لکھے گئے۔ حالانکہ آپ صاحب گلشنِ ہند کی سند پر صاحب گلزار کو ۱۲۱۵ھ سے پہلے متوفی مانتے ہیں۔

دیباچہ صفحہ ۴۴:۔ آپ لکھتے ہیں "میر صاحب نے صرف ایک شعر اس غزل کا چنا ہے جو ۱۷۱۱ء کے کسی مشاعرے کی طرح میں لکھی گئی تھی۔ اگر میر صاحب نے حاتم کا حال زیادہ بعید زمانے میں لکھا ہوتا تو ان کی بعد کی کہی ہوئی غزلوں کے شعر بھی چنتے جو دلی کے مشاعروں میں برابر پڑھی جاتی رہی تھیں"

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی غالب کے حال اور نمونۂ کلام میں ان کا صرف یہ ایک شعر

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

لکھے تو اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ مولف نے ۱۸۵۵ء یعنی ذوق کی وفات سے پہلے غالب کا حال لکھا ہے کیوں کہ بقول آزاد (آب حیات ص۵۱۴) ذوق نے اس شعر کی تعریف کی تھی۔ ہماری نظر میں حاتم۔ خود بہت بڑے شاعر اور ایک سو فی صدی شاعر کے استاد ہیں اور ان کی استادی کا حق اسی وقت ادا ہوتا کہ میر صاحب کم از کم پچیس شعر ان کے انتخاب کرتے لیکن اس کی کیا تدبیر کہ خدائے سخن حاتم کو "مرد جاہل و نکمل" سمجھتا تھا۔ یہ ایک شعر بھی ان کی طبع نازک پر گراں ہے۔

گلشن سخن، کی تالیف کا زمانہ آپ نے یوں معین کیا ہے "دیباچے میں مصنف نے آج پھولا سخن کا گلشن" مادۂ تاریخ لکھا ہے جس سے ۱۱۹۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ چونکہ کتاب میں بھی جا بجا ہی سنہ اکنوں، یا 'الحال' کے ساتھ مذکور ہے اور مصنف کا دعویٰ بھی ہے کہ کتاب تھوڑے عرصے میں تصنیف ہوگئی تھی اس لئے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس ایک سال کے اندر کار تالیف سے مبتلا فارغ ہوگیا تھا۔"

لیکن خاتمے کے صفحہ سفر کے حاشیے میں آپ لکھتے ہیں "مبتلا در گلشن سخن (۳۴ ب) می گوید شیخ محمد حاتم موطنش دہلی و معاصر نجم الدین، آبرو بودہ، زبانش بازبان ولی دکنی مناسبت دارد، میر عبد الحی تاباں از تلامذۂ اوست، شاعر فصیح بیاں و سرآمد ریختہ گویاں (بود) دیوانش دو ہزار بیت بلکہ زیادہ" تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ آبرو کا انتقال ۱۱۶۱ھ کا مطابق سنہ عیسوی ۱۷۴۷ء ہے اور حاتم کا انتقال ۱۱۹۷ھ میں ہوا یعنی گلشنِ ہند کے اختتام کے تین سال بعد اس لئے سرآمد ریختہ گویاں کے بعد بریکٹ میں (است) چاہئے نہ کہ (بود) ورنہ آپ کے اصول کے مطابق ماننا پڑے گا کہ تذکرے کا انجام ۱۱۶۷ھ کے بعد ہوا ہے۔

دیباچہ صفحہ ۶۴ :- نواب صدر یار جنگ بہادر فرماتے ہیں۔

"تذکرہ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں مثنوی رموز العارفین ہے۔ گلزارِ ارم نہیں ہے رموز العارفین کا سالِ تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اور گلزارِ ارم کا ۱۱۹۲ھ ہے۔

رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔"

تذکرے کا آغاز ۱۱۸۸ھ کے بہت بعد کا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی تالیف کے زمانے میں رموز العارفین مشہور ہو چکی تھی اور اس مثنوی کو کسی پہلے کے کارنامے کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں سے مشہور ہونا تھا۔ سحر البیان تو گیارہ سال بعد کی تصنیف ہے اور ۱۱۸۸ھ سے پہلے بھی اس کا آغاز ہو سکتا ہے وہ اس طرح کہ جب ۱۱۸۸ھ میں یہ مثنوی لکھی گئی اور مشہور ہو چکی تو اس کا کام بھی پہلے سے لکھے جانے والے تذکرے میں درج کر دیا گیا۔ لیکن ۱۱۹۲ھ کی تالیف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں گلزار ارم نہیں ہے یعنی یہ تذکرہ ۱۱۹۲ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اب نواب صاحب موصوف کی تحقیق کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ خود میر حسن نے خاتمۂ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "در تاریخ ۱۱۹۱ھ باتمام رسید" اور اس تذکرے کے آغاز و انجام کے متعلق دیباچے کے چھ صفحوں کا خلاصہ یہ ہے کہ "میر حسن نے ۱۱۸۴ھ یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۹۱ھ میں ختم کر دیا تھا اور بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی ہے لیکن تاریخ انجام کے بارے میں آپ نے نواب صاحب کے صحیح تخمینے اور درست قیاس کی داد نہیں دی جو ضروری تھی۔

دیباچہ صفحہ ۹۰:۔ مخزن الغرائب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں "دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۸ھ میں مصنف کو اس کی ترتیب و تالیف سے فراغت ہوتی ہے" چند سطروں کے بعد لکھا ہے :۔ "کتاب خانہ عالیہ رامپور میں اس کی جلد اول کے دو نسخے ہیں مگر دونوں ناتمام ہیں اس بنا پر اس کے آغاز و انجام وغیرہ کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے۔"

اس عبارت سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ (۱) مذکور نسخے جلد اول ہونے کے لحاظ سے ناتمام ہیں (۲) یا ان کے دیباچوں کے صرف اسی قدر حصے باقی رہ گئے ہیں جن سے تاریخ انجام مفہوم ہوتی ہے

آخر میں آپ لکھتے ہیں: "مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود ہے"۔ جب یہ بات ہے تو جو کتاب حسب ایمائے بندگان ہمایوں اعلیٰ حضرت فرماں روائے رامپور دام اقبالہم وملکہم، تصحیح وتحشیے کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور بیادگار عقدِ سعید نکاح حضور مرشدزادۂ آفاق نواب لیعہد بہادر ہے اس کی تکمیل کے لئے ناممکن تھا کہ نواب صاحب موصوف اپنا نسخہ مستعار دینے میں دریغ فرماتے یا آپ خود حبیب گنج پہنچ کر اس کو دیکھ آتے۔ جو کتاب ہمارے ملک میں ہے اور جس سے آغاز وانجام کے متعلق ہم خود قطعی فیصلوں پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے آغاز وانجام کے بارے میں ڈاکٹر اسپرنگر اور ڈاکٹر لیٹنر کے مشتبہ اقوال کیوں نقل کئے جائیں۔ مذکورۂ بالا جملے سے آپ کا مفہوم کچھ ہو لیکن قرائن بلا وجہ نواب صدر یار جنگ بہادر پر افسوس کریں گے اور دلیل یہ ہوگی کہ نواب صاحب موصوف مذکور تذکرہ کی کو بتانے تک کے روادار نہیں ورنہ محال تھا کہ ریاست رامپور ایک شخص کے سفر اور حبیب گنج میں چند ہفتوں کے قیام کے اخراجات برداشت نہ کرتی۔ اس لئے یا تو یہ آخری جملہ حذف ہو جانا چاہئے یا مکمل نسخہ دیکھنے کے بعد ہی اس کے متعلق رائے لکھی جائے۔

دیباچہ صفحہ ۶۹:۔ تذکرۂ میر حسن قلمی کی عبارت یہ ہے: "از نجبائے امروہہ مولدش اکبر پور کہ قصبہ ایست متصل"۔ لیکن خاتمے کے صفحہ ۹۳ میں مولوی عبدالقادر حیف رامپوری خود مصحفی کی زبانی فرماتے ہیں۔ "می گفت کہ مولد من بلم گڈھ است کہ متصل شاہجہاں آباد است"۔ ان میں سے کس کا قول مرجح ہے۔

دیباچہ صفحہ ۱۰۴:۔ (مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے سخن شعرا میں) داغ کا تذکرہ حالیہ صیغوں میں کرکے تحریر کرتے ہیں کہ ۱۲۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ کون داغ ہیں۔ نواب مرزا خاں داغ (استاد اعلیٰ حضرت واقدس میر محبوب علی خاں) کا انتقال ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں ہوا ہے۔

دیباچہ صفحہ ۱۸۴:۔ انجمن ترقی اردو نے اسے (عقد ثریا از مصحفی) شائع کیا ہے۔ مگر کوئی سطر غلطی سے پاک نہیں۔ انجمن نے جو بعض نایاب قلمی کتابیں شائع کی ہیں ان میں یہ نقص موجود ہے خصوصاً دریائے لطافت کا جو فارسی نسخہ شائع کیا ہے وہ دریائے لطافت مطبوعہ مطبع آفتاب عالمتاب مرشدآباد کا مہذب اور

مختصر ایڈیشن ہے میں نے اپنی تالیف "انشا" کے سلسلے میں ان دونوں کا مقابلہ کیا تو انجمن کے نسخے میں بیسیوں مقام غلط نکلے اور اس غلط فارسی نسخے کا مخدومی علامہ کیفی نے جو ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ اس پر آپ کا جملہ صادق آتا ہے۔ اس لئے کتاب کے اہم مطالب خبط ہو گئے ہیں۔ مثلاً صرف اردو ترجمے کی مدد سے آپ "درداتۂ اول در بیان کیفیت زبان اردو و حروف تہجی اردو" سے "حروفے کہ دریں زبان بہ تلفظ در می آید ہشتاد و پنج حروف است نزد فصیحانِ اہلِ تحقیق و نزد عوام و تحقیق ناآشنایاں نود و پنج حروف است" کے مطابق ۸۵ اور ۹۵ حروف شمار کرنے کی سعی کیجئے گا۔ آپ یقیناً پریشان اور ناکام ہوں گے اور اسی سے میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔ ترجمہ مذکور ہندوستان بھر کے اعلیٰ نصابوں میں داخل ہے اور طلبہ قواعد کی ایک ایسی کتاب جو انشا نے لکھی تھی مگر اب اس کے مطالب وہ نہیں رہے جو انشا نے بیان کئے تھے۔ تبرکاً و تیمناً پڑھے جا رہے ہیں۔

ماخذ حواشی میں آپ نے جن کتابوں کی تفصیل لکھی ہے وہ اگر نادر اور کمیاب قلمی کتابوں ہی تک محدود ہوتی تو دیباچے کا وقار قائم رہتا۔ آپ نے چند ایسی کتابوں کا تعارف کرانے کی زحمت گوارا فرمائی ہے جو چھپ چکی ہیں اور ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں ان کا صرف حوالہ دے دیا جاتا تو کافی تھا۔ موجودہ صورت میں یہ دیباچہ "تاریخ ادب و زبانِ اردو" پر کسی کتاب خانہ کی فہرستِ کتب معلوم ہوتا ہے۔

خاتمے کے حاشیوں میں جو نوٹ لکھے گئے ہیں وہ تعریف سے مستغنی ہیں۔ اس کی افادی حیثیت عدیم النظیر ہے۔ میری نظر سے تاریخ ادب یا زبانِ اردو کی اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں اس قدر سیر حاصل اور جامع حواشی مہیا کئے گئے ہوں۔ التجا ہے کہ مہجور کے مدائح الشعرا کا جو اقتباس آپ نے خاتمہ ص ۱۰۶ پر دیا ہے اس میں "نواب سعادت علی خاں بہادر۔ . . . . ." کے بعد کی عبارت نقل کرا کے روانہ فرمائیں۔